ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

March 2021

مال ودولت کا مقصد

اسلام نے بہت ہی قوت کے ساتھ اس عقیدہ اور ذہنیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا دار العیش نہیں ہے، دار الامتحان ہے، یہاں کا مال ودولت اور سامان آرائش و راحت سب آزمائش کے لیے ہے، یہ زندگی ایک مختصر یا طویل فرصت عیش نہیں ہے، بلکہ فرصت عمل ہے، یہ مال ودولت اس لیے نہیں ہے کہ اس سے عیش وعشرت کے اسباب اور لہو و لعب کا سامان پیدا کیا جائے، بلکہ یہ آخرت کی جنس ثواب اور رضائے الٰہی کے لیے دنیا کا سکہ ہے، یہ زندگی لذت وتمتع کا اصل مقام نہیں ہے، اس کا اصل مقام اس زندگی کے بعد کی جنت ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

Rs. 15/-

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي

دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

غیظ وغضب اور اس کا علاج

علامہ سید سلیمان ندویؒ

’’غیظ وغضب کی بے اعتدالی بہت بڑی برائی ہے، بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ وغضب اور غصہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے، اس لیے ایک مسلمان کو چاہیے کہ اپنے غصہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ وغضب کا اظہار نہ کرے، اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصہ کو دبا لیتے ہیں؛ ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ﴾ اور دوسری جگہ فرمایا؛ ﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں، انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے، لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے‘ معاف کرنا آسان نہیں ہے، لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ’’پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسرے کو پچھاڑ دے، پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے کو قابو میں رکھے۔‘‘

آنحضرت ﷺ نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں، ایک روحانی اور دو ظاہری، روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے، یعنی یہ کہ چوں کہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے، اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں، (أعوذ باللہ کا یہی مطلب ہے) خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کر لے گا، ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے، مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کر لے، اس سے منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔‘‘

(سیرۃ النبی: ۶/ ۴۵۶-۴۵۸)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۳ — مارچ ۲۰۲۱ء - رجب المرجب ۱۴۴۲ھ — شمارہ: ۳

سرپرست: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ (صدر، دارعرفات)

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمود حسن حسنی ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

آداب زندگی

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"إِذَا نَظَرَ أَحَدُكُمْ إِلَىٰ مَنْ فُضِّلَ عَلَيْهِ فِي الْمَالِ وَالْخَلْقِ، فَلْيَنْظُرْ إِلَىٰ مَنْ هُوَ أَسْفَلَ مِنْهُ"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(جب تم میں سے کوئی شخص کسی ایسے انسان کو دیکھے جو مال و دولت اور شکل وصورت میں اس سے بڑھا ہوا ہو تو اس کو ایسے شخص کا دھیان کر لینا چاہیے جو خود اس کے مقابلہ میں کم درجہ کا ہو)

(صحیح البخاری: ٦٤٩٠)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر "پیام عرفات" مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: Rs.15/- — E-Mail: markazulimam@gmail.com — سالانہ زرتعاون: Rs.150/-

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

کامیابی کا راستہ (اداریہ).....۳

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

ملک کی اخلاقی اصلاح - اولین فریضہ.....۴

.....مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

غلبہ اسلام کی کوششیں.....۶

.....حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ

سچائی کیا ہے؟ (مسلسل).....۷

.....بلال عبدالحی حسنی ندوی

امت مسلمہ کی جامعیت.....۹

.....عبدالسبحان ناخدا ندوی

رؤیتِ ہلال کے چند احکام.....۱۱

.....مفتی راشد حسین ندوی

GDP - ملک کی مجموعی پیداوار.....۱۳

.....سید محمد مکی حسنی ندوی

نبی ﷺ کا طرزِ دعوت.....۱۷

.....محمد ارمغان بدایونی ندوی

ذاتی واجتماعی تعصب - مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب..۱۹

.....محمد نفیس خاں ندوی

اے منبع حقائق واے مصدر یقیں!

نتیجۂ فکر:- مولانا محمد سمعان خلیفہ ندوی - بھٹکل

اے رشک اولین وتمنائے آخریں
محبوب کبریا وسیحائے عالمیں

بعد از خدا بزرگ ثنائے جمیل ہے
اے آبروئے حسن گلستان مرسلیں

پایا تجھی سے زیست کی تعمیر کا سراغ
معمار زندگی تری تعلیم دل نشیں

قصر توہمات کو مسمار کردیا
اے منبع حقائق واے مصدر یقیں

سیرت ہے تیری حق وصداقت کی وہ کتاب
ذہن ودل وشعور سبھی جس کے خوشہ چیں

دنیا میں باکمال معلم بہت ہوئے
لیکن تری مثال بشر کو ملی نہیں

جس دم بڑھے ہیں جانب سدرہ ترے قدم
رفعت سے آشنا ہوا تب رتبۂ زمیں

پھیلی نگاہِ نور سے ہر سمت روشنی
رشک مہ تمام ہے تیرا رخ حسیں

سمعانؔ کی بر آئے وہ دیرینہ آرزو
حسان کا بہشت میں کہلائے ہم نشیں

مدیر کے قلم سے

بلال عبدالحی حسنی ندوی

کامیابی کا راستہ

یہ دنیا انقلابات کی دنیا ہے، نہ ہمیشہ کے لیے کوئی طاقت وحکومت لے کر آتا ہے اور نہ ہمیشہ کوئی کسمپرسی کے عالم میں پڑا رہتا ہے، عروج وزوال کی داستانیں دہرائی جاتی رہی ہیں اور دہرائی جاتی رہیں گی، مسبب حقیقی گرچہ وہی ہے مگر یہ عالم اسباب ہے جو اپنے اندر نفع پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ مفید ثابت ہوتا ہے، اس کے لیے عروج وبقا کا فیصلہ ہوتا ہے اور جو اپنے آپ کو سمیٹ لیتا ہے، اس کو سمیٹ دیا جاتا ہے، عروج وزوال کی تاریخ اسی سود وزیاں سے جڑی ہوئی ہے، بلکہ بقاء انفع کا قانون بے لاگ اپنا کام کرتا ہے، وہ اپنا اور پرایا نہیں دیکھتا، جو دیتا ہے اس کو عزت ملتی ہے، لینے والا ہاتھ ہمیشہ نیچے رہتا ہے، عروج وزوال کی تاریخ ان ہی صفات واخلاق سے جڑی ہوئی ہے، طاقت کے زور پر بہت دن نہ حکومتیں چلتی ہیں، نہ عزتیں قائم رہتی ہیں؛ ﴿تِلْكَ الأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (یہ (آتے جاتے) دن ہم لوگوں میں ادل بدل کرتے رہتے ہیں)

حالات سخت سے سخت ہوں، راستے مسدود نظر آتے ہوں، زمین کتنی ہی تنگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہو، لیکن ارشاد ربانی ہے؛ ﴿فَأَمَّا مَن أَعْطَى وَاتَّقَى ☆ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى ☆فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى﴾ (تو جہاں تک اس کا تعلق ہے جس نے (اللہ کے راستہ میں کچھ) دیا اور پرہیزگاری اختیار کی اور بھلی بات کو سچ مانا تو ہم آہستہ آہستہ اس کو آسانی کی طرف لے چلیں گے)

تین صفات کا اس آیت میں تذکرہ ہے جس سے راستے کھلتے ہیں، آسانیاں پیدا ہوتی ہیں، ان تین صفات میں سب سے پہلی صفت ''اعطاء'' کی ہے، یہ نافعیت والی بات ہے، دینے کا مزاج بنے، اخلاق کی بلندی پیدا ہو، دینے والے کے لیے اللہ کی طرف سے بلندی کا فیصلہ ہے، جو نعمتیں اللہ نے دی ہیں ان میں ان لوگوں کو شریک کی جائے جو ان نعمتوں سے محروم ہیں، مال ودولت بھی نعمت ہے، اس سے اللہ کے بندوں کی خدمت کی جائے، بھوکوں کو کھلانا، بیماروں کی دوادارو کرنا، کمزوروں کی مدد محتاجوں اور ضرورت مندوں کی خبر گیری، مقروضوں کے قرض کی ادائیگی سب اس میں شامل ہے، توانائی بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے، اس کے ذریعہ اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچانا، ان کے کام آنا' یہ بھی دینے والی صفت ہے، اسی طرح اللہ نے جو ایمان واخلاق کی نعمت بخشی ہے، جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں، اس نعمت کو بھی تقسیم کرنے کا مزاج بنے، ایسی ایمانی واخلاقی زندگی اختیار کی جائے جو بذات خود دینے والی ہو، جس کو دیکھ کر ضرورت مندوں کو اپنی ضرورت کا احساس ہو اور وہ ایمان واخلاق کی دولت حاصل کرنے کے لیے بے چین ہو جائیں اور ہماری زندگی سراپا دینے والی زندگی بن جائے۔

دوسری صفت ''تقوی'' کی زندگی ہے، احتیاط کا مزاج ہو، اللہ کا دھیان رہے، حرام وحلال کا فرق پیش نظر رہے اور پھر تیسری صفت ''حسنیٰ'' پر یقین کرنے اور اس کو سچ جاننے کی ہے اور حسنیٰ کے معنی اچھائی کے ہیں، اللہ کے حکم اور اس کے نبی ﷺ کی باتوں پر یقین ہو، دل سے ان کو سچ جانا جائے کہ یہ بنیاد ہے، سب سے بڑھ کر یہ یقین انقلاب برپا کرتا ہے، حقیقت میں یہ بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کا کام کرتا ہے۔

یہ تین وہ بنیادی صفات ہیں جن سے بند راستے کھلتے ہیں، آسانیاں پیدا ہوتی ہیں، لیکن یہ ایک دن کا کام نہیں، یہ مسلسل محنت ہے، ایمان واخلاق کی گرمی پیدا ہوتی جائے گی، سختیوں کی برف پگھلتی چلی جائے گی۔

دینے والا مزاج بنے، تقوی کی زندگی ہو اور اچھائیوں پر یقین ہو، اس کے آگے ترقیوں کی وہ لامتناہی سیڑھیاں ہیں جس کی منزل اس دنیا میں وہ بلندی اور عزت ہے جو کبھی مسلمانوں کا مقدر رہ چکی ہے اور آخرت میں جنت کی وہ نعمتیں ہیں جو کبھی نہ ختم ہونے والی ہیں۔

ملک کی اخلاقی اصلاح-اولین فریضہ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

قوموں کی زندگی کے اتار چڑھاؤ اور دنیا کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ قومی اور سیاسی زندگی میں سوسائٹی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، صحیح اخلاقی اور پختہ سیاسی سمجھ اور ایک اچھی سوسائٹی حکومت کو پیدا کرتی ہے، اس کی تنظیم کرتی ہے، اس کو ترقی دیتی ہے، زاج سے اس کی حفاظت کرتی ہے، جب اس کی رگیں خشک ہونے لگتی ہیں اور اس میں بڑھاپے کی علامتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں تو اس کی رگوں میں تازہ اور گرم خون پہنچاتی ہے، اس کو وقت پر ذمہ دار، پرجوش اور کام کے آدمی دیتی ہے، حقیقت میں مہذب و منظم سوسائٹی جو یقین کی دولت، اصول و اخلاق کا سرمایہ، فرض کا احساس اور ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتی ہے، وہ سرچشمہ ہے جس سے خوش حالی، آزادی، آزادی اور ترقی کی نہریں نکلتی ہیں اور پورے ملک کو ہرا بھرا رکھتی ہیں، اگر سوسائٹی میں اخلاق کی گراوٹ وبے اصولی اور خود غرضی، خوشامد، طاقت و دولت سے مرعوبیت، بزدلی اور ظلم کا چلن عام ہوجائے اور دماغی اور اخلاقی حیثیت سے وہ سوسائٹی دیوالیہ ہوجائے تو یوں سمجھئے کہ زندگی کا سوتا خشک ہوگیا اور قومی زندگی کے درخت کو گھن لگ گیا، حکومتوں کا الٹ پھیر، طاقت کی بہتات، ملک کی پیداوار، تعلیم کی ترقی اور ظاہری دھوم دھام کوئی چیز اس قوم کو تباہی سے نہیں بچا سکتی، جب کسی درخت کی جڑیں اور رگیں سوکھ جائیں اور وہ اندر سے کھوکھلا ہوجائے تو اوپر سے پانی ڈالنے سے کام نہیں چلتا۔

دنیا کی تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، روم کی سلطنت کا دنیا میں ڈنکا بجتا تھا، کم کسی قوم نے ایسے اچھے منتظم، قانونی دماغ اور اعلیٰ فوجی افسر پیدا کیے ہوں گے جیسے رومی قوم نے، لیکن جب رومی سوسائٹی کو بداخلاقی اور عیش پرستی کا روگ لگ گیا اور اس کے جسم میں ظلم، ناانصافی اور ناجائز طرف داری کا زہر دوڑ گیا تو اس کی قسمت کا ستارہ گردش میں آیا اور اس کو اندر اور باہر کے دشمنوں نے دبوچ لیا، وہ روم جس کی تمام دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی، یورپ کی نیم وحشی قوموں کے حملوں سے اپنی زندگی سے تنگ تھا، نہ راتوں کو میٹھی نیند نصیب تھی، نہ دن کو چین، پھر چھٹی صدی عیسوی میں ایرانیوں نے اس کے مشرقی حصہ پر حملہ کرکے اس کی عزت خاک میں ملا دی، نوے ہزار آدمیوں کو قتل کیا، اس کی تمام نوآبادیوں اور ملکوں پر قبضہ کرلیا اور اس کے پایہ تخت قسطنطنیہ کو گھیر لیا، پھر اس کے چند برس بعد ہی جب رومیوں کو بہ مشکل سنبھلنا نصیب ہوا تھا، عرب کی مٹھی بھر بے حقیقت فوجوں نے دھاوا بول دیا۔

روم کی سوسائٹی اخلاقی حیثیت سے اتنی کمزور اور کھوکھلی ہوگئی تھی کہ ہرقل جیسا لائق جنرل اور دلیر بادشاہ جس نے اپنی تنظیمی قابلیت اور فوجی لیاقت سے ایرانی فوجوں کو اپنے ملک سے نکال کر ایران کے قلب میں اپنا رومی جھنڈا گاڑ دیا تھا اور ایرانی حکومت کو الٹ پلٹ کرکے رکھ دیا تھا، اس گرتی ہوئی رومی سوسائٹی کو تھام نہ سکا اور عربوں کو جن میں دین کا جوش، شہادت کا شوق اور اخلاق کی طاقت تھی، اپنا ملک حوالہ کردینا پڑا۔

ہماری ہندوستانی سوسائٹی پرانے زمانہ میں اپنے فلسفہ وحکمت اور ادب و شاعری میں نیز اخلاقی جرأت، سچائی، ایمان داری اور بے لاگ پن میں کہاوت کی طرح مشہور تھی، یہاں کی اخلاقی کہانیاں اور اخلاق کے اعلیٰ اصول سوغات کی طرح دیس دیس جاتے تھے، پانچویں صدی میں ایران نے جو علم و تہذیب کا مرکز تھا، ایک بہت بڑا عالم بھیجا تاکہ وہ یہاں کی اخلاقی تعلیم اور اخلاقی کہانیوں کا پہلوی زبان میں ترجمہ کرے، عربوں نے بھی اپنے دور

میں ان کہانیوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، چینیوں نے اپنی دانائی اور مانے ہوئے علم کے باوجود اس ملک کے علم وحکمت کے خزانوں سے برابر فائدہ اٹھایا اور اپنے بڑے بڑے فلسفیوں اور مذہبی عالموں کو بھیج کر اس ملک کی استادی اور بڑائی کا اقرار کیا، آج بھی اس کی پراچین کہانیوں اور گیتا اور رامائن میں بڑی سچی اور گہری باتیں ہیں۔

لیکن رفتہ رفتہ ہندوستانی سماج مختلف قسم کی اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا شکار ہوتا چلا گیا، بے اصولی، عیش پسندی، خودغرضی، جعل سازی پیدا ہوگئی، مسلمان جو کبھی ہندوستانی سماج سنبھالنے والے تھے، اب اخلاقی اور سماجی خرابیوں کے شکار بلکہ اصل ذمہ دار تھے، خانہ جنگی، ناجائز طرف داری، بے جا پاس داری، بے وفائی، وعدہ خلافی کا دور دورہ تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کا انتظام درہم برہم ہوگیا، شہروں میں اطمینان اور راستوں میں امن نہیں رہا، ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک افراتفری مچی تھی، اللہ کا کسی سے رشتہ نہیں، اپنی زمین کی تباہی اور اپنے بندوں کی بربادی دیکھ نہیں سکتا، یہاں اس ملک میں کسی میں حکومت کی لیاقت نہیں تھی، اس نے سات سمندر پار کی ایک قوم کو بھیج دیا جس میں ملکی انتظام کی قابلیت تھی اور زندگی کا سلیقہ تھا، حقیقی اخلاق کا تو اس میں پتہ نہ تھا، مگر زندگی کے کچھ ایسے اصول رکھتی تھی جن کی بنیاد پر وہ کچھ مدت تک کسی ملک کا انتظام کرسکتی تھی اور نئی نئی حکومت چلا سکتی تھی، اس نے سڑکیں بنائیں، ڈاک خانے، تار گھر، شفاخانے جگہ جگہ قائم کیے، ریلیں دوڑائیں، پولیس کا اچھا انتظام کیا، دفتری نظم ونسق قائم کیا، لیکن ہندوستانی سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچایا، اس کے رہے سہے اچھے اوصاف اور ہندوستانی ومشرقی کیریکٹر کی خوبیاں مٹائیں اور نئی خرابیاں پیدا کردیں، جو ایک ایسی حکومت کا لازمی نتیجہ ہیں جس کو رومی سلطنت سے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا زرّیں اصول ترکہ میں ملا تھا۔ زبان وادب، تہذیب ومعاشرت کا فرق اس ملک میں ہمیشہ رہا لیکن انگریزی حکومت اور اس کی تعلیم گاہوں اور دفاتر سے پہلے وہ عداوت اور رقابت کبھی نہیں پیدا ہوئی جو ناسور بن کر ۱۸۵۷ء میں بہہ پڑی۔

۱۹۴۷ء میں جب اس ملک کو آزادی ملی تو تربیت کی کمی، ذاتی یا قومی خودغرضی اور جہالت اور آدمیت کے احترام کے فقدان نے اس ملک کے لوگوں میں وہ دیوانگی پیدا کردی کہ انسان انسانوں کے حق میں درندے اور سانپ اور بچھو بن گئے، بے کس عورتوں کی بے آبروئی کی گئی، شیرخوار بچوں کو سنگینوں و بھالوں سے قتل کیا گیا، چلتی ہوئی ریل سے مسافروں کو پھینکا گیا، کنوؤں میں زہر ملایا گیا، جلتی چتا میں جیتے جاتے آدمیوں کو بٹھا کر جلا دیا گیا، ایک ایسا ملک جس کی اخلاقی سطح اتنی پست اور اس دیس کے بہت سے رہنے والے آدمیت اور تہذیب سے اتنے کورے ہوں، کیا اس ملک میں اخلاقی اصلاح اور سماجی سدھار سے بڑھ کر کوئی مسئلہ اہمیت رکھتا ہے؟

ایسی صورت میں ملک کا سب سے بڑا مسئلہ جس پر تمام سیاسی رہنماؤں اور ملک کے سچے خیرخواہوں کو پوری توجہ کرنی چاہیے تھی اور اس کو اپنی مصروفیتوں میں پہلی جگہ دینی چاہیے تھی، اس ملک کی اخلاقی اصلاح، سماجی سدھار اور ذمہ داری کا احساس تھا، درحقیقت ملک کی موجودہ صورت حال میں اس مسئلہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے یا تیسرے درجہ کے مسئلہ کو اپنا موضوع بنالینا اور کسی فرض سبب کو اس ملک کی موجودہ بدحالی کا حقیقی سبب قرار دے لینا، ایک ایسا اخلاقی جرم ہے جس کو اس ملک کا ہوشمند مؤرخ معاف نہیں کرے گا، جس ملک میں انسانی زندگی کی ابتدائی باتوں کی تبلیغ کی ضرورت ہو، جس ملک میں عام انسانی اخلاق کی کمی ہو، جہاں لوگ بڑھی ہوئی رشوت، پھیلی ہوئی چور بازاری اور حد سے بڑھی ہوئی نفع خوری کی وجہ سے اپنی جان سے عاجز ہوں، جہاں اخلاقی اور قانونی جرائم میں ترقی ہو، وہاں ان تمام چونکا دینے والے واقعات سے آنکھ بند کرکے صرف ''ایک کلچرایک زبان'' کی بے معنی رٹ لگائے جانا اور اس کو ہر مرض کی دوا سمجھنا اور اس پر زبان اور پریس کی تمام طاقتوں کا صرف کردینا اس ملک کے ساتھ کہاں کا انصاف ہے؟!

غلبۂ اسلام کی کوششیں

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی

اسلام ایک جامع ' معتدل اور متوازن مذہب ہے، اس کا مطالبہ ہے کہ انسان ظاہری عبادات کی پابندی کے ساتھ معاشرتی حسن وسلوک میں بھی بلند پایہ ہو، ٹھیک اسی طرح مذہب اسلام کا اس بات پر بھی اصرار ہے کہ انسان محض فکروفن اور علم وتحقیق کے پیچ وخم میں اس طرح پھنس کر نہ رہ جائے کہ عبادات اور باطنی صفات کو بھول بیٹھے، کیونکہ عام طور پر کسی ایک چیز میں حد سے زیادہ غلو دوسری چیزوں میں کوتاہی کا باعث ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عوام الناس سے یہ شکوہ کرتا ہے کہ دین اسلام کو عملی زندگی میں نافذ کرنے کے سلسلہ میں ان کی سستی اور غفلت حد سے بڑھی ہوئی ہے اور وہ محض چند ظاہری رسوم وعبادات کے مکلف رہ گئے ہیں، تو یقیناً اسے ان خواص امت پر بھی شکوہ کناں ہونا چاہیے، جنھوں نے ذاتی اصلاح کی اہمیت کو نظر انداز کر رکھا ہے، جب کہ ذاتی اصلاح کی طرف توجہ انتہائی ضروری ہے، یہ توجہ احکامات الٰہیہ کی ادائیگی میں روحانی اسپرٹ کو تیز کرنے کا کام کرتی ہے، اس کے بغیر اسلام کی حقیقت محض فکر وفلسفہ کی رہ جاتی ہے جو بلاشبہ عمدہ تعبیرات واستعارات سے مزین ہوتی ہے مگر دل کے نہاخانوں میں اس کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ تاریخ اسلام میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ اسلام جب روحانی اسپرٹ سے لیس تھا تو اس نے حیرت انگیز کارہائے نمایاں انجام دیے اور ایک تاریخ رقم کی، تاہم جو اسلام محض فکر وفلسفہ سے عبارت تھا' وہ ہمیشہ ایسے مثالی دور کی نظیر پیش کرنے سے قاصر رہا۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اسلام کی خاطر جو بھی علمی وفکری کوششیں عالم میں جاری ہیں' ان کی اہمیت کو گھٹا کر بیان کرنا ہمارا مقصود ہرگز نہیں ہے، بلکہ ہمیں پورا اعتراف ہے کہ وہ تمام کوششیں ناقابل تحقیر وتذلیل ہیں، مگر ہمارا مقصد ان اندیشوں اور خطرات کا اظہار ہے جو حقیقی ایمانی تربیت کے فقدان پر ہونا یقینی ہے، یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ عقل کا مؤمن ہونا بہت ضروری ہے مگر جس قوت سے تسخیر عالم ممکن ہے وہ دراصل دل کا مؤمن ہونا ہے، اس لیے کہ دل ہی کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ عقل کو اپنے مقاصد کے حصول میں ساتھ چلنے پر مجبور کردے، جب کہ محض عقل کی بنیاد پر یہ ممکن نہیں کہ دل بھی عقل کا ساتھ دینے پر مجبور ہو، یہی وجہ ہے کہ دل کا مؤمن اور تربیت یافتہ ہونا انتہائی ضروری ہے، دل کی اصلاح پر توجہ کی جتنی ضرورت ہے' شاید ہی کسی دوسری چیز پر اتنی ضرورت ہو۔

موجودہ دور کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ امت مسلمہ عمومی طور پر باطنی صفات سے تہی دامن اور ایک تن بے جان کی مانند ہو چکی ہے، اس کے اندر جاہلیت کے سنگین حملوں سے مقابلہ کی تاب نہیں ہے اور نہ ہی یورپ کی کھوکھلی فکری یلغار سے آنکھیں ملانے کی جرأت ہے، چنانچہ اس کے تمام تاروپود ایک ایک کرکے بکھرتے چلے جارہے ہیں، غور کا مقام ہے کہ کیا ایسے نازک ترین حالات میں مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ محض چند نظریاتی کوششوں سے حل ہوسکتا ہے؟ کیا یہ طوفان بلاخیز ان جذباتی دعووں سے ٹل سکتا ہے جن کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں یا ان جوشیلے نعروں سے تھم سکتا ہے جو وقتاً فوقتاً عالم اسلام میں بلند ہوتے ہیں اور ان کی گونج ہمارے کانوں سے ٹکراتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ امت مسلمہ اس وقت عملی تربیت کی شدید متقاضی ہے، اس وقت کوئی لفاظی یا شوروہنگامہ اس کے لیے سودمند نہیں ہوسکتا، بلکہ اسے خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی نافعیت کا راز خاموش مزاجی کے ساتھ عملی استقامت میں ہے، اس وقت اس کے لیے تربیت کا وہی نسخہ اکسیر ہے جو نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کی گھٹی میں پلادیا تھا......

(باقی صفحہ ۱۶/پر)

مسلسل

سچائی کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

اللہ کے ساتھ سچائی کا معاملہ:

﴿فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْراً لَّهُمْ﴾(محمد: ۲۱)

(تو یہی ان کے لیے بہتر ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ سچے رہیں)

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر لوگ اللہ سے سچے رہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ اللہ سے سچا رہنا کیا ہے؟ دراصل ہم نے اللہ سے ایک وعدہ کیا ہے، جس میں سب سے پہلا مرحلہ تو وہ ہے جب اللہ نے عہد الست لیا، فرمایا:

﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى﴾(الأعراف: ۱۷۲) (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ وہ بولے کیوں نہیں)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کو رب سمجھنا، اس کا عقیدہ رکھنا، اس کے مطابق زندگی گذارنا، اس کا لحاظ رکھنا، یہ گویا کہ اللہ سے سچے رہنے کے مترادف ہے۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ لوگ اللہ سے سچے رہتے تو ان کے لیے بہتر تھا اور دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ہمیں اللہ کے نبی ﷺ نے جو شریعت دی ہے اور زندگی گزارنے کا جو راستہ ہم کو دیا ہے، اس راستہ کو اختیار کرنا اور اس کی موافقت کرنا گویا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ سے سچا رہنا ہے۔

سچائی کی تعریف:

سچائی کیا ہے؟ سچائی حقیقت میں موافقت ہے کہ جو ہمیں حکم ملا ہے اور ہم نے وعدہ بھی کیا ہے کہ ہم اس کے مطابق زندگی گذاریں گے، اب اگر کوئی اس پر عمل کر رہا ہے تو اللہ سے وہ گویا کہ سچا ہے اور اگر اس سے ہٹ کر زندگی گزار رہا ہے تو گویا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم ایمان والے ہیں، اپنا نام بہت شاندار رکھتا ہے، محمد علی نام رکھتا ہے، لیکن اس کی زندگی بالکل غیروں کی زندگی ہے، نام سے اور کام سے کوئی جوڑ نہیں ہے، تو سوچنے کی بات ہے کہ یہ سچائی ہے یا جھوٹ ہے؟ عمل کا سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ نام تو بڑا اعلیٰ قسم کا ہے، لیکن جو زندگی ہے اس کا اس نام سے کوئی جوڑ نہیں ہے، آپ دیکھ لیجیے کہ اس وقت کیا صورت حال ہے، مسلمانوں کا اس وقت کیا حال ہے؟ اس وقت غیروں کو یہ کہتے ہوئے سنا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی زندگی عجیب ہوتی ہے، نہ ان کا علم سے کوئی تعلق، نہ ان کا صفائی ستھرائی سے کوئی تعلق، نہ ان میں آپس میں کوئی اتحاد ومحبت، یہ جہاں رہیں گے لڑیں گے جھگڑیں گے، گندگی پھیلائیں گے، جہالت کریں گے، گالیاں بکیں گے، معاملات خراب ہوں گے، جھوٹ بولیں گے، دھوکہ دیں گے، ظاہر بات ہے یہ صفات خالص اسلام سے ہٹی ہوئی ہیں، لیکن مسلمان نام ہونے کے باوجود آج یہ صفات ہم مسلمانوں کے اندر ہیں، غور کا مقام ہے کہ کیا ہمارا یہ اللہ سے سچ رہنا ہے یا جھوٹ رہنا ہے؟

اللہ نے فرمایا کہ اگر وہ اللہ کے ساتھ سچے رہتے تو ان کے لیے بہتر تھا۔ سچا رہنا یہ ہے کہ دین کی موافقت زندگی کے اندر پائی جائے، نام کی موافقت زندگی کے اندر پائی جائے، نام جو ایمان والا ہے اس کی موافقت زندگی کے اندر پائی جائے، جیسا نام ویسا کام، جیسا شریعت کا حکم ویسی ہی زندگی، اگر یہ تطابق ہے، یہ موافقت ہے تو ''صدق'' ہے اور اگر موافقت نہیں ہے تو ''کذب'' یعنی جھوٹ ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر اللہ سے وہ سچے رہتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی اس کی عین ترجمان تھی، قرآن مجید میں خود کہا گیا کہ جب ان سے کہا گیا کہ اب تو لشکر جمع ہو گئے اور وہ چڑھائی کرنے والے ہیں تو وہ کہتے تھے کہ یہ تو ہونا ہی ہے؛

﴿الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَاناً وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ﴾

(وہ لوگ کہ جن سے کہنے والوں نے کہا کہ (مکہ کے) لوگوں نے تمہارے خلاف بڑی جمعیت اکٹھا کر رکھی ہے تو ان سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے ہمیں تو

اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے)

صحابہ کرام کو دوسرے لوگ ڈراتے تھے کہ دیکھو کیا کیا ہو رہا ہے؟ اب تو تمہارے لیے خطرہ ہے تو وہ صاف کہتے تھے کہ ہمیں کوئی خطرہ کی بات نہیں ہے، یہ تو جو ہم سے کہا گیا اس کے عین مطابق ہو رہا ہے، گویا اس کو دیکھ کر ان کے ایمان کے اندر اور اضافہ ہوتا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ سچائی کا مفہوم انہوں نے سیکھا تھا اللہ کے نبی ﷺ کی صحبت میں، آگے جو کچھ ہے وہ سب انہی کا فیض ہے، بڑے بڑے اولیاء اللہ کی زندگی ہمارے سامنے ہے، بڑے بڑے علماء ومشائخ کی زندگی ہمارے سامنے ہے، حقیقت میں وہ سب حضرات صحابہ کی زندگی کا عکس ہے، وہیں سے لوگوں نے سیکھا ہے، آپ ﷺ معلم اول ہیں اور صحابہ آپ ﷺ کے سب سے پہلے شاگرد ہیں اور پھر صحابہ پوری امت کے معلم ہیں، امت کو جو کچھ دین ملا، وہ صحابہؓ سے ملا اور سب سے بڑھ کر وہ دین کے لیے سچے اور اللہ کے ساتھ سچی زندگی گذارنے والے تھے اور یہی "صدق" ہے جس کا ہم سے مطالبہ کیا جاتا ہے۔

اب ہم صرف نام اچھا رکھیں، مسلمانوں کی فہرست میں ہمارا اندراج ہو، لیکن خدانخواستہ موافقت نہیں ہے، ہماری زندگی دین کے مطابق نہیں ہے تو یہ اندراج تنہا کافی نہیں ہے۔ حضرت مولاناؒ ایک جملہ کہتے تھے، عجیب بات فرماتے تھے کہ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے قبرستانوں میں نہ جانے کتنے مسلمان ایسے ہیں جو مسلمانوں کے نام سے دفن ہوتے ہیں لیکن مسلمان نہیں ہوتے، ظاہر ہے نام سے کوئی مسلمان نہیں ہوتا، اگر کوئی غیر ہمارے قبرستان میں جنازہ لے کر آجائے دفن کرنے کے لیے تو ہم مصیبت کر دیں گے، فساد ہو جائے گا، ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا، لیکن نہ جانے کتنے غیر مسلم مسلم ناموں سے ہمارے قبرستانوں میں دفن ہوتے ہیں، اس لیے کہ ان میں سچائی نہیں ہوتی، نام کچھ ہوتا ہے اور کام کچھ ہوتا ہے۔

اسی لیے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر اللہ سے سچے رہتے تو یہ ان کے لیے بہتر تھا، جب یہ دین ملا ہے، یہ ایمان کی نسبت ملی ہے تو اب یہ ذمہ داری بھی ہماری ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنی زندگی گذارنے کی کوشش کریں، یہ سچائی کی علامت ہے اور اگر اس کے مطابق ہم نے زندگی نہیں گذاری تو یہ سب سے بڑا جھوٹ ہے۔

زبان کی حفاظت کی ضرورت:

﴿مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾ (ق: ۱۸)

(جو بات بھی اس کے منہ سے نکلتی ہے تو اس کے پاس ہی ایک مستعد نگراں موجود رہتا ہے)

اس آیت میں فرمایا گیا کہ نہ خود دھوکہ میں نہ رہیں اور نہ اللہ کو دھوکہ میں ڈالیں، کوئی بھی بات کہہ کر اس چکر میں نہ رہیں کہ ارے کون سا فرق پڑتا ہے، ایک بات ہی تو زبان سے کہی ہے، آئی گئی ختم ہو گئی، اللہ تبارک وتعالیٰ صاف فرماتا ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِن قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ﴾

یعنی جو بات بھی ان کی زبان سے نکلتی ہے، اللہ نے ایسا فرشتہ متعین کر دیا ہے جو بالکل گھات میں تیار رہتا ہے، کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو زبان سے نکل جائے اور چھوٹ جائے، آج ہم دیکھیں کہ اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے ایسے ذرائع آگئے ہیں کہ آدمی جو کہتا ہے، جو بولتا ہے، جو حرکت کرتا ہے، سب محفوظ ہو جاتا ہے، اب تو سمجھنا بڑا آسان ہے کہ جو کراماً کاتبین بیٹھے ہوئے ہیں، وہ کون ہیں؟ اللہ نے ہر شخص کے ساتھ دو ایسے فرشتے متعین کر دیے ہیں جو ایک ایک حرف اور ایک ایک نقطہ جو زبان سے نکل رہا ہے، یا ایک ایک عمل جو انسان کر رہا ہے، وہ سب لکھتے ہیں اور ایسے لکھتے ہیں جیسے آج ویڈیو بنایا جاتا ہے اور ویڈیو کی بھی کوئی حقیقت نہیں، یہ تو ہم انسانوں کی ایجاد ہے، اللہ کے یہاں اس کی کیا شکل ہے؟ وہ بہتر جانتا ہے۔

احادیث میں آتا ہے کہ کل قیامت کے دن جو کچھ انسان نے کہا یا کیا، وہ سارا کا سارا کچا چٹھا سامنے آجائے گا، صرف اتنا نہیں ہوگا کہ کہہ دیا جائے گا کہ تم نے ایسا کیا تھا، تم نے ایسا کہا تھا، بلکہ انسان خود اپنے آپ کو برائی کرتے دیکھے گا، دکھایا جائے گا کہ دیکھو تم کیا کرتے تھے، وہاں کوئی عمل جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

امت مسلمہ کی جامعیت

عبدالسبحان ناخداندوی

کسی بھی چیز کے درمیانی، مرکزی اور سب سے بہترین حصہ کو "وسط" کہا جاتا ہے، اس لحاظ سے "وسط" میں اعتدال، عمدگی اور مرکزیت کا مفہوم پایا جاتا ہے، قوم کے سب سے بہترین آدمی کو "وسط القوم أو واسطة القوم" اور "أوسط القوم" کہا جاتا ہے، "وسط الوادی" وادی کے اس حصہ کو کہا جاتا ہے جو سب سے بہتر اور انتہائی شاداب ہو۔

رسول اکرم ﷺ نے امت وسط کا مطلب معتدل کا بیان فرمایا ہے، کسی چیز کا وسط انتہائی محفوظ بھی سمجھا جاتا ہے، اس لیے اس میں حفاظت کا مفہوم بھی موجود ہے، یہ امت نصاریٰ کے غلو اور یہود کی گستاخی دونوں سے پاک ہے، نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو خدا بنا ڈالا اور یہود نے خود اللہ رب العزت کی شان میں گستاخیاں کیں، اسی طرح نصاریٰ رہبانیت کا شکار ہوئے، افراط میں مبتلا ہو کر اپنی دولت گنوادی۔ یہود کوتاہی اور تفریط میں مبتلا ہو کر کہیں کے نہ رہے۔

اس امت کو اللہ تعالیٰ نے ہر اعتبار سے معتدل بنایا، یہود بے عمل تھے اور نصاری بے علم، دونوں سیدھے راستہ پر نہ رہ سکے، اس امت کو علم و عمل کا جامع بنایا گیا، اس امت کو جو شریعت دی گئی وہ کامل ترین شریعت ہے، اسی لیے اللہ رب العزت نے اس امت کے دین کے لیے کمال اور اس امت پر اپنے انعامات کو بیان کرنے کے لیے "اتمام" کا لفظ ارشاد فرمایا جو اس کی جامعیت اور ہمہ گیری بیان کرنے کے لیے کافی ہے؛

﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ (آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کیا، اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور اسلام کو تمہارے لیے بطور دین کے پسند کرلیا)

یہ آیت امت وسط کی جامع ترین تشریح ہے، اللہ کی طرف سے اس امت پر کوئی سخت بوجھ نہیں لادا گیا اور امتوں پر ایسے بوجھ لاد دیے گئے تھے؛

﴿رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا﴾ (اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جو تو نے ہم سے اگلوں پر ڈالا تھا)

یہ دعاء بھی ہے اور اس امت کے تعلق سے اللہ کا فیصلہ بھی ہے، اس شریعت میں اللہ کی رضامندی کو پانا بہت آسان کردیا گیا، اسی لیے تمام قومیں اس امت میں شامل ہو کر پناہ حاصل کرسکتی ہیں، یہ بھی اس امت کی شریعت کی جامعیت کی دلیل ہے۔

اس امت کے لیے جس عظیم نبی کا انتخاب ہوا، ان کو جامع الاوصاف والکمالات بنایا گیا، ان کے نمونہ کو تمام انسانوں کے لیے یکساں سب سے بہترین نمونہ قرار دیا گیا، ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کا دائمی اعلان کیا گیا، قیامت تک آنے والی نسل انسانی کو قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے جو طریقے مطلوب ہیں وہ پورا نمونہ رسول ﷺ کی ذات میں رکھ دیا گیا، زندگی کا کوئی گوشہ ایسا خالی نہیں رکھا گیا جس میں رسول ﷺ کا نمونہ موجود نہ ہو، اسی لیے اس امت کے رسول کو عالمی رسول بنایا گیا نیز اس امت کے لیے جو کتاب اتری اسے بھی عالمگیر حیثیت عطا ہوئی۔

اس امت کو جسمانی و روحانی تقاضوں کی تکمیل کے سب سامان عطا کیے گئے، جسمانی حقوق کی ادائیگی کے متعلق نصیحت ہے؛

"إن لجسدك عليك حقا و إن لنفسك عليك حقا وإن لزوجك عليك حقا" (بلاشبہ تمہارے جسم کا تم پر حق ہے اور تمہارے نفس کا تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے)

اور روح کی تسکین کے لیے یہ ہدایت دی گئی؛

"وإن لربك عليك حقا" (اور بلاشبہ تمہارے پروردگار کا بھی تم پر حق ہے)

خلوت اور جلوت دونوں طور زندگی سے اسے آشنا کیا گیا، اسے خلوت نشین بنا کر زندگی سے کاٹا بھی نہیں گیا، نہ جلوت کا عادی بنا کر مادہ پرستی کی راہ دکھائی گئی، خلوت وجلوت کا مکمل اعتدال بخشا گیا، جلوت میں یہ حکم دیا گیا: ﴿وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ (اللہ کے تعلق اتنی کوشش کرو کہ اس کا حق ادا کردو)

اور خلوت میں یہ حکم ملا: ﴿فَإِذَا فَرَغْتَ فَانصَبْ☆وَإِلَىٰ رَبِّكَ فَارْغَبْ﴾ (جب آپ فارغ ہو جائیں تو عبادت میں مشقت اٹھایئے اور اپنے رب سے لو لگایئے)

ادائیگی حقوق کی ایک طویل فہرست اسے دی گئی، تاکہ اس کے خیر سے کوئی محروم نہ رہے، یہ فہرست اللہ رب العزت کی ذات سے شروع ہو کر یتامی ومساکین جیسے کمزوروں تک محیط ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ﴾ (عبادت اللہ کی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو، قرابت داروں، یتیموں اور مسکینوں پر توجہ دو، مسافروں اور زیر ملکیت باندی غلاموں کے ساتھ بہترین معاملہ کرو)

جو مرکزی حیثیت کا حامل ہوتا ہے اس کے ذمہ ضروری ہے کہ سب کا بے حد خیال رکھے، اس لیے اس امت پر انسانیت کے تمام گوشوں کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری عائد کی گئی، اسے عطا کردہ قوانین ایک فرد بشر سے لے کر بین الاقوامی سیاست تک محیط ہیں، فرد کی اصلاح کے لیے حکم ہوا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ﴾ (اے ایمان والو! تمہارے ذمہ اپنے آپ پر توجہ دینا ہے)

عالم کی اصلاح کے لیے یہ حکم دیا گیا: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾ (تم سب سے بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو، تمہیں بھلائیوں کا حکم دیتے رہنا پڑے گا، برائیوں سے روکتے رہنا پڑے گا اور اللہ پر مکمل ایمان رکھنا ہوگا)

رسول ﷺ کو بے اعتدالی ناپسند تھی، اسی لیے جب تین صحابہ نے یہ عہد کیا کہ ایک ہمیشہ روزہ رکھے گا، دوسرا ہمیشہ رات میں مکمل عبادت کرے گا اور تیسرا شادی نہیں کرے گا تو آپ نے اسے ناپسند فرمایا، اس لیے کہ امت کے مجموعی مزاج کے خلاف یہ عمل تھا، پھر یہ بات ارشاد فرمائی کہ میں تم سب سے زیادہ اللہ کا خوف اور پاس ولحاظ رکھتا ہوں لیکن میں رات میں سوتا بھی ہوں اور عبادت بھی کرتا ہوں، کبھی روزہ رکھتا ہوں کبھی بغیر روزہ کے بھی رہتا ہوں، میں شادی بھی کرتا ہوں، جو میرے طریقہ کو نظر انداز کرے گا وہ میرا نہیں۔

اسی طرح بعض صحابہ نے دور دراز کے گوشہ میں جا کر عافیت کی زندگی بسر کرنی چاہی تو آپ نے اس سے منع فرمایا، گویا اس کا حکم دیا کہ لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا اور ان کے کام آنے کی کوشش کرنا اس امت کا مزاج ہے اور اپنی ذمہ داری سے فرار اختیار کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

اس امت کو تمام لوگوں پر گواہ بنایا گیا ہے اور اس کی خاطر وہ بھرپور علم بھی دیا گیا ہے، جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اللہ کو کیا پسند ہے اور کون سی چیز اسے ناپسند ہے، گواہی کے لیے عمل کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جس کام کے اچھا ہونے کی وہ گواہی دے رہا ہے خود بھی وہ کام کرے تب اس کی گواہی مکمل ہوگی، اسی طرح بعض کام کو وہ غلط قرار دے رہا ہے، خود بھی اس سے دور رہے، اسی طرح گواہی کے لیے جرأت کی بھی ضرورت ہوتی ہے، وہ ڈنکے کی چوٹ پر صحیح کے صحیح ہونے اور غلط کے غلط ہونے کو بتائے، اسی طرح گواہی کے لیے ترغیب وترہیب اور نفع ونقصان سے بالاتر ہونے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے اس امت پر واجب ہے کہ وہ حق کی گواہی میں کسی نفع نقصان کی پرواہ نہ کرے، نہ کسی کی ترغیب میں پھنسے، نہ کسی کی ترہیب سے ڈرے، یہود نے نفع ونقصان کے چکر ہی میں اپنے دین کا کباڑا کر ڈالا، ترغیب وترہیب میں آ کر کتاب الٰہی تک کو بیچ دیا، وہ شہادت کا فریضہ ادا نہ کر سکے، اس لیے نکال باہر کر دیے گئے۔

رؤیت ہلال کے چند احکام

مفتی راشد حسین ندوی

اسلام میں چاند کے مہینوں کی اہمیت:

اسلام کی کئی عبادات ایسی ہیں جن کا مدار چاند کے مہینوں پر رکھا گیا ہے، چنانچہ رمضان کے روزوں اور حج کا مدار چاند کے مہینوں پر ہے، اسی طرح زکوۃ بھی چاند کے اعتبار سے سال مکمل ہونے پر فرض ہوجاتی ہے، اس کے بارے میں کتاب وسنت میں کثرت سے نصوص وارد ہوئی ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الأَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ﴾ (البقرۃ: ۱۸۹) (وہ آپ سے نئے چاند کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ یہ لوگوں (کے مختلف معاملات) کے لیے اور حج کے لیے اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں)

دوسری جگہ رمضان کے مہینہ کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہے: ﴿فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵) (تو جو اس مہینہ کو پالے وہ اس میں روزہ رکھے)

اسی طرح حدیث میں بھی صراحت سے رمضان وعید منانے کے لیے رؤیت ہلال کی صراحت کی گئی، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”چاند دیکھ کر تم لوگ روزہ رکھا کرو اور اسی کو دیکھ کر عید منایا کرو اور اگر وہ تم سے پوشیدہ کر دیا جائے تو شعبان کے تیس دن مکمل کرلو۔“ (بخاری: ۲۵۱۴)

ان نصوص کے پیش نظر فقہاء نے چاند دیکھنے سے متعلق کئی احکام کتاب وسنت کی روشنی میں مستنبط فرمائے ہیں، ذیل میں چند ضروری مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) چاند تلاش کرنا ضروری ہے:

چونکہ بہت سے احکام کا مدار رؤیت ہلال پر ہے، اس لیے ضروری ہے کہ چاند والے مہینوں کی ۲۹/تاریخ کو اس کے تلاش کرنے کی کوشش کی جائے، فقہاء نے خاص طور سے ۲۹/شعبان کو چاند کی تلاش کرنے کو واجب قرار دیا ہے۔ (ہندیہ: ۱/۱۹۷)

لیکن ظاہر بات ہے کہ تنہا شعبان یا عید بقرعید کے چاند کو تلاش کیا جائے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر چاند کمیٹی موجود ہو اور اس کے متعلقہ افراد اس کام کو انجام دیں، تو بقیہ لوگوں کے ذمہ سے بھی اس ذمہ داری کی ادائیگی ہوجائے گی، اس لیے کہ اس کا انداز بھی واجب کفائی کا ہے۔

(۲) مطلع جب صاف ہو:

جب مطلع صاف ہو تو رمضان، عید اور تمام مہینوں کے ثبوت کے لیے جم غفیر یا بالفاظ دیگر اتنے افراد کا چاند دیکھنا شرط ہے جن کی گواہی سے حاکم یا قاضی یا ہلال کمیٹی کو ان کی سچائی کا غلبہ ظن حاصل ہوجائے، اس صورت میں اگر ایک دو افراد گواہی دیں تو ان کی گواہی معتبر نہ ہوگی۔ (ہدایہ مع الفتح: ۲/۲۵۰-۲۵۳، ہندیہ: ۱/۱۹۷-۱۹۸، شامی: ۲/۹۸-۱۰۳)

(۳) جب مطلع صاف نہ ہو:

جب بدلی یا گرد وغبار کی وجہ سے رمضان کا چاند نظر نہ آئے تو ایک عدل بلکہ صحیح قول کے مطابق مستور الحال اگر چاند دیکھنے کی اطلاع دے تو اس کی خبر قاضی یا ہلال کمیٹی قبول کرلے گی، (اگر اس دن ماہرین فن کے اعتبار سے چاند نکلنا ممکن نہ ہو تو اس کے بارے میں تفصیل آگے آرہی ہے) بشرطیکہ خبر دینے والا کھلم کھلا فاسق نہ ہو۔

جہاں تک عید اور دوسرے مہینوں کا تعلق ہے تو آسمان صاف نہ ہونے کی صورت میں بھی دو عادل افراد کی شہادت شرط ہوگی، ان کا مستور الحال ہونا کافی نہ ہوگا۔ (رسائل ابن عابدین: ۱/۲۳۴، ومصادر مذکورہ)

(۴) چاند کی شہادت کون لے گا؟

جن مقامات پر نظام قضاء موجود ہے، وہاں کی چاند کی گواہی قاضی کے سامنے ہونا چاہیے اور جہاں نظام قضاء موجود نہ ہو، وہاں

یہ فریضہ چاند کمیٹی کے ذمہ داران کے سامنے انجام دینا چاہیے، ہلال کمیٹی بھی نہ ہو تو مقامی علماء ان کے قائم مقام ہوں گے۔ (بدائع الصنائع: ۲/۲۲۲، عمدۃ الرعایہ علی شرح الوقایہ: ۱/۲۴۶، جدید فقہی مسائل: ۲/۲۷، کتاب المسائل: ۲/۴۶)

مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ نے شرح وقایہ کے اپنے حاشیہ میں اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنی کتاب جدید فقہی مسائل میں صراحت سے یہ ترتیب لکھی ہے۔

(۵) اختلاف مطالع کی حیثیت:

مطالع مطلع کی جمع ہے، یعنی وہ جگہ جہاں سے چاند یا سورج نکلتے ہیں، قرآن مجید کی تصریح کے مطابق چاند کا ایک قدرتی نظام ہے اور مہینہ کے ہر دن کے لیے اس کی منزلیں متعین ہیں، زمین کے طول البلد اور عرض البلد کے اعتبار سے ہر علاقہ میں چاند کا مطلع بھی الگ الگ ہے، اس حقیقت پر تمام فقہاء متفق ہیں اور سائنسی طور پر بھی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے، لیکن اس پر فقہاء کا اختلاف ہے کہ شرعاً اس کا اعتبار ہوگا یا نہیں؟ احناف کا اصل مسلک یہ ہے کہ اس کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، یہی قول اکثر ائمہ کا بھی ہے، لیکن متاخرین احناف خاص طور سے علماء ہند نے اس کو معتبر قرار دیا ہے اور یہ تفصیل کی ہے کہ بلاد بعیدہ میں اس کا اعتبار کیا جائے اور بلاد قریبہ میں اس کا اعتبار نہ کیا جائے اور بلاد قریبہ اور بعیدہ کی حد بندی کرتے ہوئے فرمایا کہ بلاد بعیدہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں باہم اس قدر دوری ہو کہ عادۃً ان کی رؤیت میں ایک دن کا فرق ہوتا ہو، ایک شہر میں ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہو اور دوسرے میں ایک دن بعد۔ (رسائل ابن عابدین: ۱/۲۵۱، بدایۃ المجتہد: ۱/۲۸۷، رؤیت ہلال کا مسئلہ: ۸۵، جدید فقہی مسائل: ۲/۳۴، بحوالہ تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء)

یہ بھی واضح رہے کہ ان علماء نے برصغیر ہند و پاک، بنگلہ دیش اور نیپال کا مطلع ایک قرار دیا ہے۔ (مراجع سابقہ)

(۶) ایک مطلع والے مختلف شہروں کا حکم:

جن علاقوں کا مطلع ایک ہے، ان میں کسی ایک جگہ رؤیت ہو جانے پر اصولی طور پر دوسری جگہوں پر رؤیت تسلیم کر لینی چاہیے، لیکن دوسری جگہوں کی رؤیت کی تصدیق کی شرائط ایسے امور پر مبنی ہے جن کا تحقق عام مسلمانوں سے نہیں ہو سکتا، اس لیے ایک جگہ اعلان ہو جانے کے باوجود دوسری جگہ یہ دیکھنا پڑے گا کہ اس کی اطلاع شرعی اعتبار سے معتبر ذرائع سے آئی ہے یا نہیں؟ اس کا فیصلہ حکام اور ان کی غیر موجودگی میں علماء ہی کر سکتے ہیں، لہٰذا اس اعلان پر عمل مسلمانوں پر اسی وقت لازم ہوگا جب مقامی قاضی یا رؤیت ہلال کمیٹی اس کا اعلان کرے، ان دونوں کی غیر موجودگی میں امام یا با اثر عالم ان کا قائم مقام ہوگا، ان کے اعلان کے بعد ان کے حلقہ اثر تک کے علاقہ کے تمام مسلمانوں پر صوم وفطر لازم ہو جائیں گے۔ (شامی: ۲/۱۰۵، عمدۃ الرعایہ: ۱/۲۴۶، رؤیت ہلال کا مسئلہ: ۵۳)

(۷) فلکی حساب سے مدد لینا:

آج کل ایک سوال کثرت سے کیا جاتا ہے کہ اگر ماہرین فلکیات سے مدد لی جائے تو چاند کے سلسلہ میں ہونے والے اختلافات کو ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن ماہرین فلکیات سے مدد لینے کی تجویز کو ماننے سے تمام علماء نے متفقہ طور پر رد کر دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں صوم وفطر کا اعتبار رؤیت پر رکھا گیا ہے، ماہرین فلکیات صرف امکان رؤیت کو بتا سکتے ہیں، رؤیت کی پیش گوئی نہیں کر سکتے، البتہ فقہاء نے صراحت کی ہے کہ ”فلکیاتی تحقیق سے اس قدر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ جس تاریخ کو طلوع ہلال کا امکان نہ ہو، اس روز رؤیت ہلال کی شہادت کافی تحقیق اور ناقابل تردید تعداد کی گواہی کے بغیر تسلیم نہ کی جائے اور جس دن فنی اعتبار سے طلوع ہلال کا امکان زیادہ ہو، اس دن معمولی خبر پر بھی اعتبار کیا جا سکتا ہے۔“ (جدید فقہی مسائل: ۲/۲۶، رسائل ابن عابدین: ۱/۲۴۵-۲۴۹، شامی: ۲/۱۰۰) (باقی صفحہ ۱۸ پر)

GDP
(ملک کی مجموعی پیداوار)

سید محمد مکی حسنی ندوی

دنیا کا ہر ملک اپنے مالی سال کے آخر میں یہ اندازہ لگاتا ہے کہ اس کے سیاسی حدود میں پورے سال کتنی مالیت کی پیداوار (Products) ہوئی ہے اور کتنی مالیت کی خدمات (Services) پیش کی گئیں، اصطلاحی طور پر اسے GDP (Gross Domestic Product) یعنی "ملک کی مجموعی پیداوار" کہتے ہیں۔

کسی بھی ملک کی معاشی ترقی وتنزلی کا بہت کچھ انحصار اس کی GDP پر بھی ہوتا ہے، اگر ملک کی GDP زیادہ ہے تو اس کا سیدھا مفہوم یہ ہے کہ اس ملک میں غربت اور بے روزگاری کے مواقع کم ہیں اور وہ ملک خوشحال ہے۔

یہاں یہ بات واضح رہے کہ GDP میں وہ پیداوار شامل نہیں ہیں جو دوسرے ملکوں سے حاصل کی جاتی ہیں، بلکہ گلوبلائزیشن (Globalisation) کے اس دور میں معاشی اصول یہ کہتا ہے کہ GDP کے مؤثر و مفید ہونے کے لیے اس ملک میں درآمدات (Imports) کے مقابل میں برآمدات (Exports) زیادہ ہونی چاہیے، اس اصول کو "Foreign Balance of Trade" (تجارت کا غیر ملکی توازن) کہا جاتا ہے۔

ہمارے ملک ہندوستان کی GDP کو اس کی معاشی تاریخ کے آئینہ میں بہتر انداز سے سمجھا جا سکتا ہے:

ماہرین اقتصادیات کے نزدیک ہندوستان کے معاشی عروج کا آغاز 3300 ر قبل مسیح میں "دریائے سندھ کی تہذیب" سے ہوتا ہے جسے "Indus Valley Civilization" بھی کہتے ہیں۔ اس وقت ملک کی معیشت کا انحصار زراعت وتجارت اور خاص کر بیرون ملک تجارت پر تھا۔ ویدک دور کی ابتداء سے یعنی ایک ہزار سال قبل مسیح سے مغل سلطنت تک برصغیر ہندوستان (متحد نہ ہونے کے باوجود) دنیا کی سب سے بڑی معیشت تھا۔ اور اس کی GDP پوری دنیا میں 24% سے 32% تک قائم تھی۔

مغلیہ سلطنت میں: ہندوستانی صنعتی کمیشن (Indian Industrial Commission - 1916-18) کے الفاظ ہیں: "جب مغربی تاجر مہم کار نے پہلی دفعہ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اس ملک کی صنعتی ترقی کسی بھی طرح بہت زیادہ ترقی یافتہ یورپی ملکوں سے کمتر نہ تھی۔" کاشت اور حرفت کے سامان کے علاوہ فنون لطیفہ اور دستکاری کے کافی متنوع اقسام منظر عام پر تھے، جو غیر ملکی منڈیوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔

ہندوستان کی اصل بنیادی غذائی اشیاء اس وقت بھی وہی تھے جو آج ہیں، یعنی گیہوں، چاول، مکئی، جوار وغیرہ، تجارتی فصلوں میں نیل، روئی، گنا اور ریشم کی پیداوار تھی۔ تمباکو کی پہلی بار کاشت سترہویں صدی کے اوائل میں گجرات میں ہوئی، لیکن رفتہ رفتہ پورے ملک کے تمام حصوں میں پھیل گئی۔

مغل دور حکومت کے برآمدات کے متعلق 'بال کرشنا' اپنی کتاب "Economic History of India-1757-1966" میں لکھتے ہیں: "ہندوستان؛ دنیا کی رقم اور اجناس کی گردش اور تقسیم کے لیے سانس لینے والے عضو کی مانند تھا، یہ وہ سمندر تھا جس میں تجارت اور صنعت کے تمام دریا بہتے تھے اور اس نے اپنے باشندوں کو خوشحال کیا"۔

معیار زندگی کے لحاظ سے اہل ثروت وہ سب کچھ حاصل تھا جو اس کی ترقی یافتہ دنیا میں موجود تھا، خوبصورت مکانات، مہنگے لباس، خواتین کے لیے جواہرات وغیرہ باآسانی مہیا تھے۔ عام آدمی کے لیے کھانے اور رہنے کے لیے اس سے بہتر پر دسترست تھا جو کہ

انیسویں صدی میں ممکن ہوسکتا ہے۔ مورلینڈ (Moreland) اپنی کتاب "India at the death of Akbar" میں اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''.....اس لحاظ سے غریب اور عام طبقہ بہتر صارفین تھے، اناج، دودھ اور گھی ہندوستان کے بڑے حصہ میں روایتی طور پر تیار ہوتا تھا، سترہویں صدی کو وافر مقدار اور سستا سامان کے لیے جانا جاتا ہے''۔

پیداوار، برآمدات، صنعت وحرفت اور عوامی فلاح و بہبودگی کے لحاظ سے ہندوستان مغل دورِ حکومت میں اپنی بلندی پر تھا، معاشی اعتبار سے ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی طاقت تھا، اٹھارہویں صدی کی ابتداء تک اس کی GDP چوبیس اشاریہ چار تین فیصد (24.43%) یعنی چار ہزار پانچ کروڑ ڈالر کی سالانہ آمدنی تھی۔

برطانوی سامراج میں: ہندوستان میں انگیزوں کی آمد تجارت کے عنوان سے ہوئی تھی، لیکن جلد ہی انھوں نے تجارت کی آڑ میں بدعنوانی، لوٹ مار اور غریبوں کا استحصال شروع کردیا، برطانیہ میں تیار شدہ کپڑوں کو ہندوستان میں مقبول بنانے کے لیے ہندوستان کی صدیوں پرانی صنعت کو بڑی بے رحمی سے تباہ کیا۔ 1814ء سے 1835ء تک برطانوی کپڑوں کی تجارت میں 51/ گنا اضافہ ہوا جب کہ ہندوستان سے برطانیہ کو درآمدات صرف چوتھائی رہ گئی۔ مقامی کاریگروں اور کسان کو ٹیکس نے مارا۔ 1765ء کے معاہدہ الہ آباد کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے راتوں رات لگان بڑھا کر 50/ فیصد کردیا۔

انگریزوں نے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے جہاں ایک طرف ہندستانی صنعت کو نقصان پہنچایا وہیں یہاں کی زراعت کو بھی اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کیا، کسانوں کو دھان اور سبزیوں کے بجائے انڈیگو (نیل)، پوست اور اس جیسی اشیاء کی کاشت کاری کے لیے مجبور کیا جن کی تجارت ان کے حق میں مفید تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی عوام کو کھانے پینے کی ضروری اشیاء میں دشواریوں کا سامنا کرنا، اور پھر قحط پر قحط کا سلسلہ شروع ہو گیا، چنانچہ برطانوی سامراج کے محض سو سال کے اندر ملک میں 34/ دفعہ قحط پڑا اور ہر قحط کے بعد انگریز لگان میں اضافہ کردیتے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک ڈائریکٹر ہنری سینٹ جارج ٹکر (Henry St George Tucker) نے لکھا کہ ہندوستان کو ایک صنعتی ملک کی حیثیت سے گرا کر ایک زرعی ملک بنادیا گیا ہے، تا کہ انگلستان کا مال ہندوستان میں بیچا جاسکے۔

ملک بھر میں قحط اور پھر افراط زر کی مارا ماری تھی، روپے کی کوئی قدر (Value) باقی نہ بچی تھی، کپڑوں کی صنعت تباہ ہوچکی تھی اور ہندوستان کی جگہ برطانیہ دنیا کا سب سے بڑا صنعت کار بن چکا تھا۔ مغلیہ دور کے ہندوستان کی 24.43% GDP کی لڑھکتی ہوئی 2% تک پہنچ چکی تھی، جبکہ ہندوستان کے سنٹرل بینک میں تقریباً ایک سو ساٹھ کروڑ ڈالر جمع تھے لیکن اس پر برطانیہ کا قبضہ تھا۔

آزاد ہندوستان میں: آزادی کے بعد کانگریس پارٹی نے اقتدار میں آتی ہے، اس کو ایسا ہندوستان ملتا ہے جس کی صنعتیں ختم ہوچکی ہیں، کروڑوں انسان مرکھپ چکے ہیں اور جو بچ گئے ہیں ان میں بھی ایک تعداد قحط کے شکار ہے۔ کیمبرج کے معاشی تاریخ داں اینگس میڈیسن (Angus Maddison) کی تحقیق ہے کہ ہندوستان کی GDP 24% سے 2% رہ گئی تھی۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ لکھتے ہیں: ''برطانوی راج میں سب سے روشن زیور (ہندوستان) فی کس آمدنی کے اعتبار سے بیسویں صدی میں دنیا کا سب سے غریب ملک تھا''۔

آزاد ہندوستان کا پہلا بجٹ نومبر 1947ء میں پیش ہوا، پنڈت جواہر لال نہرو نے 1948ء میں صنعتی پالیسی پیش کی اور آٹھ بڑے سرمایہ کاروں کو Bombay Plan پر لگادیا، ان سرمایہ کاروں میں ٹاٹا اور برلا جیسی کمپنیاں شامل تھیں، سرکار کو ابتداء میں تنقید کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر یہ اقدام ہندوستان کی ترقی کی بنیاد ثابت ہوا۔ پھر 1951ء میں پانچ سالہ ترقی ماڈل پیش کیا گیا، اس منصوبہ میں زرعی اور آبپاشی کے نظام کو بہتر بنانے پر توجہ مرکوز کی، جو کامیاب رہا

اور تقریباً ساڑھے تین فیصد سالانہ ترقی ہوئی اس طرح 1953ء تک ملک کی GDP میں چھ فیصد کا اضافہ ہوا۔ 1956ء میں دوسرا پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا گیا، اس منصوبہ نے ہندوستان کی طویل مدتی نمو کو بہتر بنانے کے لیے معاشی جدید کاری کی بنیاد رکھی۔

سوادیشی تحریک (Swadeshi movement) کی تجدید، سبز انقلاب (Green Revolution)، سفید انقلاب (White Revolution)، اور 1965ء میں پاکستان پر فتح کے بعد کی معاشی پالیسیوں نے پچیس سال کی ترقی کا راستہ ہموار کر دیا، اس سال GDP ترقی کر کے 7.58% کو پہنچ گیا۔

1964ء میں نہرو اور 1966ء میں شاستری جیسے ماہر معاشیات کے انتقال کے بعد اندرا گاندھی نے حکومت سنبھالی، اس حکومت نے 14/نجی بینکوں کو سرکاری بینک بنا دیا تا کہ زرعی ترقی رفتار پکڑ سکے مگر یہ تجربہ پوری ناکام ہوا اور GDP گر کر محض 2% رہ گئی یہی وہ وقت تھا جب بینک سرکاری دباؤ میں آ کر قرض دینے پر روک نہ لگا سکے، اور یہ قدم بے سود قرضوں (Dud Loan) کی بنیاد بنا جو آج حساب کتاب میں نوے فیصد تک درج ہے۔

1975ء میں ایمرجنسی اور پھر مرار جی دیسائی کا 1977ء میں اسقاط زر کرنا، ان اقدامات سے ہندوستان کی معاشیات پر گہری ضرب لگی تھی۔ اور ان دونوں وقتوں میں GDP کی گراوٹ تقریباً ایک فیصدی تک ہوگئی تھی۔

1977ء میں اندرا گاندھی کی جنتا پارٹی کے ہاتھوں انتخابات میں ناکامی کے بعد 1980ء میں اندرا گاندھی نئی معاشی پالیسیوں کے ساتھ انتخابات میں کامیاب ہوئی تھیں، اس وقت چھٹا پانچ سالہ منصوبہ پیش کیا گیا، اس منصوبہ میں سرمایہ کاری پر تمام تر سوشلسٹ پابندیوں کو ہٹا دیا گیا، اس بنا پر صنعت کاری، بینک کاری، برآمدات اور درآمدات میں خاصی آسانی ہوگئی۔ 1980ء کے قبل GDP تقریباً منفی پانچ (-5) تک پہنچ چکی تھی مگر 1980ء کے بعد اس میں ترقی شروع ہوئی اور 7.17% تک پہنچ گئی۔

1983ء میں پہلی غیر ملکی سرمایہ کاری 'ماروتی-سوزوکی' کی شکل میں سامنے آئی، اس سے غیر ملکی سرمایہ کاری کا راستہ کھل گیا لیکن 1984ء میں بھوپال گیس سانحہ پیش آ گیا، جس میں ہزاروں افراد کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا، اس حادثہ نے بڑی صنعتوں کے قیام پر سوالیہ نشان لگایا اور مزید اصلاحات کی طرف توجہ دلائی۔ اس وقت GDP کی بلندی 7.85% کو پہنچ چکی تھی۔

1985ء میں اندرا گاندھی کی کی موت کے بعد ملک سیاسی کمزوری کے ساتھ ملک کی معیشت بھی کمزور پڑ گئی، گلف کی جنگ (Gulf War) نے بھی ملک کی معیشت پر برا اثر ڈالا، اور کچھ عرصہ کے لیے ملک معاشی بحران کا شکار ہوگیا۔

1991ء میں معاشی بحران کے بعد واجپائی حکومت کے وزیر مالیات یشونت سنہا نے نجکاری کی ابتداء کی اور 2004ء میں وزیر مالیات کے عہدہ سے منموہن سنگھ نے عوامی شعبوں میں نجکاری کو 5% سے 20% تک پہنچا دیا، اشیئر مارکیٹ میں چالیس گنا اضافہ ہوا۔ ٹاٹا نے برطانوی کمپنی، برلا نے امریکی کمپنی، ٹاٹا موٹرس نے برطانوی گاڑی کمپنی اور بھارتی ایئرٹل نے افریقہ کی ٹیلی مواصلاتی کمپنی کو خرید لیا، اس پانچ سالہ حکومت نے ارب پتیوں کو وجود بخشا۔ 2014ء تک ہندوستان کی GDP نے پھر سے رفتار پکڑی اور دو لاکھ کروڑ ڈالر کی سالانہ آمدنی کے ساتھ تقریباً 7% کو پہنچ گئی۔

2014ء کو مودی حکومت انتخابات میں کامیاب ہو کر اقتدار میں آتی ہے، اس حکومت نے بغیر کسی ٹھوس تیاری کے انقلابی قدم اٹھایا اور 2016ء میں نوٹ بندی کا اعلان کر دیا، جس کے سخت منفی اثرات ظاہر ہوئے، صنعت کاروں اور صارفین کی کمر ٹوٹ گئی۔

مودی حکومت نے دیوالیہ پن کوڈ (Insolvency and Bankruptcy Code) اور کسان بل وغیرہ قوانین کی وضع و ترمیم کی جن سے چور دروازوں سے مالداروں اور بڑے کاروباریوں کو فائدہ حاصل ہوا، ان کاروباریوں میں کچھ جب قرض ادا نہ کر سکے تو

ملک چھوڑ کر چلے گئے اور ایسا کوئی قانون نہیں تھا جو ان کو روکتا یا واپس لاتا۔ مزید بڑے کاروباریوں کے لیے وقتاً فوقتاً ان کے قرض پر چھوٹ اور کاروبار میں فروغ دی جاتی رہی ہے جب کہ انتہائی ضرورت مند کسان اور غریب عوام کو وعدوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

مودی حکومت نے ملک میں ٹیکس کا نیا نظام GST (Goods & Sales Tax) نافذ کیا، یہ نظام VAT (Value-Added Tax) کی جگہ پر لایا گیا اور اعلان کیا کہ 'ایک ملک ایک ٹیکس نظام' ہوگا۔ اس ٹیکس کے نظام کو پیٹرول اور ڈیزل پر نافذ نہیں کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشیائے خوردنی پر کوئی ٹیکس نہیں تھا تو اس پر ٹیکس لگایا گیا، اس کے علاوہ جن پر کم ٹیکس تھا ان پر GST آنے کے بعد ٹیکس بڑھ گیا، اس سے ملک کے خزانے میں اضافہ ہوا اور 2017 میں GDP 8% پر پہنچی مگر عوام اور صنعت کو دور رس نقصانات ہوئے۔

دفعہ 370/ کا الغاء، چھوٹے بینکوں کی تحلیل Jet Airways جیسی بڑی کمپنیوں پر اجارہ داری، نوٹ بندی، میڈیا جیسے اداروں پر اجارہ داری، پڑوسی ملکوں سے چپقلش، ذات پات اور مذہب کی منافرت، ان تمام اقدامات نے ملک کی معیشت کو خاصا نقصان پہنچایا جس کے نتیجہ میں ملک کی GDP نے پھسل کر 2018ء کے شروع میں 6.5% تک پہنچ گئی۔

2020ء میں کورونا کی عالمی وباء نے پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے لیا، نظم ونسق کی کمی کے ساتھ پورے ملک میں لاک ڈاؤن نافذ کر دیا گیا، کاروبار اور عوامی زندگی کی رفتار بالکل تھم گئی، بالآخر ملک کی GDP سارے منفی رکارڈ توڑ کر 23.9%- تک آ گری۔

اندازہ کیا جا رہا ہے کہ معاشی سال 2021ء میں ملک کو GDP میں تقریباً 7% خسارہ کا سامنا ہوسکتا ہے، ماہرین کے مطابق ملک کے حالات اور معاشی پالیسیوں کو معتدل نہ کیا گیا تو اگلے چند سالوں میں ملک بھک مری کا شکار ہوسکتا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ حکومت کے اقدامات وبیانات سے واضح ہے کہ وہ اس سلسلہ میں سنجیدہ اور فکر مند ہے۔

بقیہ: غلبۂ اسلام کی کوششیں

.....اور صحابہ کرام نے اپنے متبعین کو وہی جام نوش کرایا تھا، تربیت کا وہ نسخہ انتہائی سہل اور سادہ ہے جس میں ذرا بھی پیچیدگی نہیں ہے، اس نسخہ کی عجیب بات یہ ہے کہ وہ علمی سے زیادہ عملی ہے۔

اس کا زیادہ تر زور اصلاح قلب اور اصلاح باطن پر مرکوز ہے، کیونکہ اس کا ماننا ہے کہ حیات انسانی میں جو عقلی وفکری مسائل کی گتھیاں الجھتی رہتی ہیں، ان کو حل کرنے کا مرحلہ باطنی اصلاح کے بعد آسان تر ہو جاتا ہے۔

آج امت مسلمہ ہر دن روبہ زوال ہے اور وہ تیزی سے قعر مذلت میں گرتی ہی چلی جا رہی ہے، جاہلیت کے بودے حملوں کے مقابل مسلسل شکست فاش تسلیم کرتی جا رہی ہے، بلاشبہ اس صورت حال کا علاج محض وہ خشک تحریر وتحقیق نہیں ہوسکتی، جن کے اکثر لکھنے والے علم وفن میں ماہر تو ہیں لیکن اسلام کی حقیقی دولت سے بے بہرہ ہیں اور اگر وہ ایمان کے دعویدار ہیں بھی تو باطنی صفات سے محروم ہیں اور ان کے قلوب ایمان کی گہرائی سے خالی اور اس کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، سچی بات یہ ہے کہ یہ صورت حال انتہائی خطرناک ہے، مگر افسوس کہ اب یہی مرض اکثر علمی وفکری حلقوں میں سرایت کر چکا ہے، جس کی طرف ہر چیز سے پہلے پوری توجہ اور اصلاح کی فوری ضرورت ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اسلام کو اس وقت مخلصانہ عمل اور خاموش مزاجی کے ساتھ انتھک محنت کی ضرورت ہے، اسلام کی کامیابی اسی طرز کی محنت وکوشش میں مخفی ہے جس طرز کی محنتیں قرن اول میں کی گئی تھیں اور وہ تمام انسانیت کے لیے ایک اسوہ ہیں، بلاشبہ اسلامی نقطہ نظر سے دنیا کے موجودہ پریشان ومایوس کن حالات میں یہی ایک راستہ ہے جو تمام مسائل کا سب سے موزوں اور مفید حل ہے۔

نبی ﷺ کا طرز دعوت

محمد ارمغان بدایونی ندوی

دعوتی میدان میں داعی کی ذاتی زندگی اور اس کے طرز تخاطب کو کلیدی کردار حاصل ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی زندگی کے شب وروز بجائے خود پیغام دعوت تھے اور آپ ﷺ کا اندازِ گفتگو بھی فطری، مؤثر، دل نشیں اور پرکشش تھا۔ آپ ﷺ کے طرز دعوت میں بہت تنوع ہے، کیونکہ آپ ﷺ مخاطب کی ذہنی، فکری اور علمی استعداد خاص طور پر ملحوظ رکھتے تھے اور صحابہ کرام کو بھی اسی کی تلقین کرتے تھے۔ اگر مخاطب بدوی ہے تو اس کو اسی کے معیار اور اسی کی زبان میں سمجھاتے تھے، تاکہ اس کے سامنے بات پوری طرح واضح ہوجائے۔ اگر مخاطب اہل کتاب ہیں تو ان سے آسمانی تعلیمات کی روشنی میں بات کرتے اور وہی اسلوب اختیار کرتے تھے جو ان کو مانوس کرے۔ اگر مخاطب بادشاہ ہے تو اس کے لیے وہی اسلوب اختیار کرتے تھے جو شاہی مزاج اور معیار کے موافق ہو اور جس میں پوری سطوت کے ساتھ گفتگو کی گئی ہو، ایسی گفتگو جو عزم واستقلال سے لبریز اور مرعوبیت کے شائبہ سے بھی پرے ہو۔ آپ ﷺ کا یہ عمل اس فرمان کی عملی تصویر تھا:

"أَنْزِلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ" (لوگوں سے ان کے مرتبہ کے مطابق پیش آؤ)

آپ ﷺ کا طرزِ دعوت، حکمت، نصیحت اور مجادلۂ حسنہ سے تعبیر تھا اور حکمت کا پہلو تمام مراحل دعوت میں قدرے مشترک تھا۔ آپ ﷺ کارِ دعوت میں افراد کی بتدریج ذہن سازی کے قائل تھے اور یہی مقصود الٰہی بھی تھا، صحیح بخاری میں أم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے:

"إنما نزل أول ما نزل منه سورة من المفصل فيها ذكر الجنة والنار حتى إذا ثاب الناس إلى الإسلام نزل الحلال والحرام، ولو نزل أول شيء لا تشربوا الخمر، لقالوا: لا ندع الخمر، ولو نزل لا تزنوا، لقالوا: لا ندع الزنا أبدا" (قرآن کریم میں سب سے پہلے مفصل کی ایک سورت نازل ہوئی جس میں جنت ودوزخ کا تذکرہ تھا، یہاں تک کہ جب لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تو پھر حلال وحرام کا حکم نازل ہوا اور اگر پہلے ہی مرحلہ میں شراب کی ممانعت کا حکم نازل ہوجاتا تو یقیناً لوگ ردعمل میں یہ کہتے: ہم شراب نہیں چھوڑیں گے اور اگر ان کو حکم دیا جاتا کہ تم زنا مت کرو، تو وہ کہتے: ہم زنا نہیں چھوڑ سکتے)

آپ ﷺ کا دعوتی اسلوب نہایت نرم لہجہ تھا اور اس ہدایت کا عملی نمونہ تھا:

"عَلَيْكَ بِالرِّفْقِ وَالْقَوْلِ السَّدِيدِ وَلَا تَكُنْ فَظًّا وَلَا مُتَكَبِّراً وَلَا حَسُوداً" (نرمی اختیار کرو، محکم بات کہو اور ترش لہجہ نہ اختیار کرو اور نہ ہی گھمنڈ کرو اور نہ ہی کسی سے حسد کرو)

آپ ﷺ جب لوگوں کو وعظ ونصیحت کرتے تو مختصر اور جامع خطاب فرماتے جس میں موقع ومحل کی پوری رعایت ہوتی، آپ ﷺ صحابہ کرام کو بھی مختصر وعظ ونصیحت کی تلقین فرماتے تھے، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"أَمَرَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِإِقْصَارِ الْخُطَبِ" (ہمیں رسول اللہ ﷺ نے مختصر خطاب کی ہدایت فرمائی)

آپ ﷺ کے وعظ ونصیحت کا انداز نہایت ناصحانہ، مشفقانہ اور مربیانہ تھا، اسی لیے آپ ﷺ کا خطاب ایسا عمومی ہوتا تھا کہ کسی کی دلآزاری نہ ہوتی اور مقصود بھی حاصل ہوجاتا، اسی لیے اکثر روایات

کے شروع میں ہمیں ایسے جملے ملتے ہیں:

"مَا بَالُ أُنَاسٍ......" (لوگوں کو کیا ہو گیا ہے......)

"مَا بَالُ أَقْوَامٍ......" (لوگوں کو کیا ہو گیا ہے......)

"مَابَالُ النَّاسِ......" (لوگوں کو کیا ہو گیا ہے......)

آپ ﷺ کی طبیعت نرم خو اور مانوس کن تھی اور آپ کا یہ طبعی وصف میدان دعوت میں نمایاں تھا، خود آپ کا فرمان عالی ہے:

"إِنَّ اللّٰهَ لَمْ يَبْعَثْنِيْ مُعَنِّتاً وَلٰكِنْ بَعَثَنِيْ مُعَلِّماً مُيَسِّراً" (اللہ تعالیٰ نے مجھے سختی کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا ہے، بلکہ مجھے سکھانے والا اور آسانی پیدا کرنے والا بنا کر مبعوث کیا ہے)

آپ ﷺ ممکنہ حد تک سہولت اور اختصار سے کام لیتے تھے تا کہ مدعو اکتاہٹ سے محفوظ رہے اور اس کے جذبۂ طلب میں اضافہ کے ساتھ اُنس بھی برقرار رہے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ مَخَافَةَ السَّآمَةِ عَلَيْنَا" (نبی اکرم ﷺ ہم کو ناغہ کے ساتھ وعظ فرماتے تھے، ہماری اکتاہٹ کے اندیشہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے)

نبی ﷺ کا دعوتی مشن ۲۳ رسال پر محیط ہے، لیکن اس میں بھی مختلف مراحل ہیں، آپ ﷺ کی دعوتی زندگی کا پہلا مرحلہ وہ ہے جس میں پوشیدہ طور پر آپ کی دعوتی سرگرمیاں جاری تھیں، پھر جب متبعین کی تعداد میں اضافہ ہوا تو مکہ میں علی الاعلان دعوتی سرگرمیاں جاری ہوگئیں، مگر انداز بہت حد تک دفاعی اور مثبت تھا، جو بہر صورت صبر و تحمل پر مبنی تھا، پھر جب مکہ کے حالات از حد دگرگوں ہو گئے تو آپ ﷺ نے مدینہ منورہ ہجرت کی، جہاں آپ ﷺ کے دعوتی حدود نہایت وسیع ہو گئے اور محض دس سال کے مختصر عرصہ میں ایک عظیم امانت کی تبلیغ کا فریضہ انجام دیا۔

بقیہ: رؤیت ہلال کے چند احکام

(۸) دور بین وغیرہ سے چاند دیکھنا:

اگر دور بین کی مدد سے کسی نے چاند دیکھا تو شرعاً اس کا اعتبار کیا جائے گا، کیونکہ اس سے صرف دیکھنے میں سہولت ہوتی ہے، ایسا نہیں ہے کہ جو چیز موجود نہیں تھی اس کو دکھلا دے اور اگر ہیلی کاپٹر یا ہوائی جہاز کے ذریعہ چاند دیکھا گیا تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر اتنا اونچا نہیں اڑایا گیا جس سے مطلع بدل جاتا ہے تو اس رؤیت کا اعتبار کیا جائے گا، یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کسی ٹیلہ یا اونچی عمارت سے چاند دیکھا جائے تو شرعاً رؤیت کا اعتبار ہوتا ہے اور اگر اتنی اونچی اڑان بھری کہ مطلع بدل گیا تو اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ (ہندیہ: ۱/ ۱۹۸، کتاب المسائل: ۲/ ۴۸-۴۹)

(۹) جہاں مطلع ہمیشہ ابر آلود رہتا ہو:

جس ملک یا شہر میں مطلع ہمیشہ ابر آلود رہتا ہو اور چاند نظر آنے کی کوئی شکل نہ ہو، تو وہاں قریبی ملک سے آئی ہوئی چاند کی معتبر شہادت یا خبر مستفیض پر عمل کیا جائے گا، ایسے علاقہ کے علماء پر لازم ہے کہ وہ اتفاق رائے سے اقرب ترین ملک سے رابطہ کر کے رمضان یا عید کا اعلان کریں۔ (رسائل ابن عابدین: ۱/ ۲۵۲، فتاوی رحیمیہ: ۳/ ۷۷-۷۸، کتاب المسائل: ۲/ ۵۲)

ٹی وی اور جدید ذرائع سے استفادہ کا حکم:

ریڈیو، ٹی وی، فون اور جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ آنے والی اطلاعات پر اگر مقامی علماء کو غالب گمان حاصل ہو جائے اور شرعی ضوابط پورے ہو رہے ہوں تو ان کو معتبر مانا جاسکتا ہے اور ان کے مطابق اعلان کیا جاسکتا ہے، عام لوگوں کو خود سے فیصلہ نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ شرعی ضوابط کو سمجھنے میں ان سے غلطی ہو سکتی ہے۔ (ہندیہ: ۱/ ۱۹۹ وغیرہ)

(۱۰) جس کی گواہی نہ مانی جائے:

اگر کسی نے رمضان کا چاند دیکھا، لیکن اس کی گواہی نہیں مانی گئی تو اس کو روزہ رکھنا چاہیے اور جس نے عید کا چاند دیکھا لیکن اس کی گواہی رد کردی گئی تو اس کو دوسرے دن احتیاطاً روزہ رکھنا چاہیے۔ (ہدایہ: ۱/ ۱۹۵-۱۹۶، بدائع: ۲/ ۲۲۱)

ذاتی واجتماعی تعصب

مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب

محمد نفیس خاں ندوی

مسلمانوں کے زوال میں تعصب کا بھی کلیدی کردار ہے، انسان حق بات جانتا و پہچانتا ہے مگر قومی ہمدردی، لسانی ہم آہنگی، مسلکی اتحاد یا سیاسی اشتراک کی وجہ سے وہ اختلاف کرتا ہے اور کبھی محض نفسانی خواہش یا جذبات کی تسکین کے لیے اختلاف کرتا ہے، اگر یہ مرض انفرادی اور ذاتی طور پر پایا جائے تو ممکن ہے کہ اس کے اثرات پوری قوم یا معاشرہ پر نہ پڑیں لیکن جب کوئی قوم یا گروہ من حیث القوم تعصب وانا پرستی کو اپنا وطیرہ بنالے تو اسے تباہ وبرباد ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

جب حق کا معیار دلیل کے بجائے ''اپنی ذات'' یا ''اپنے لوگ'' کو بنالیا جائے تو حق کے دروازے خود بخود بند ہوجاتے ہیں، امت کا اتحاد پارہ پارہ ہوجاتا ہے اور اختلاف وانتشار کی آگ اسے کھوکھلا کردیتی ہے۔

مسیلمہ کذاب کے پیروکار سمجھتے تھے کہ وہ جھوٹا اور فریبی ہے لیکن پھر بھی اس کے نبی ہونے کا اعتراف کرتے تھے، ان سے پوچھا جاتا کہ جب تم جانتے ہو کہ یہ جھوٹا ہے تو پھر اس کے دعوی نبوت میں اس کے ساتھ کیوں ہو؟ تو وہ جواب دیتے کہ جھوٹا ہی سہی ہے تو ہمارے قبیلہ کا۔ طلحہ نمری (سردار قبیلہ) کو اسی قومی تعصب نے تباہ وبرباد کردیا، غور کیجیے کہ اس کا یہ جملہ کتنے گہرے اور کتنے زہریلے تعصب کا غماز ہے:

"أشهد أنك كذاب وأن محمدا صادق ولكن كذاب ربيعة أحب الينا من صادق مضر." (تاريخ الطبري: ۵۰۸/۲)

(میں گواہی دیتا ہوں کہ تو جھوٹا ہے اور محمد سچے ہیں لیکن ربیعہ کا جھوٹا ہمارے نزدیک مضر کے سچے سے بہتر ہے)

بنو امیہ کے دور میں قبائلی تعصب کے اثرات خوب نمایاں ہوئے، حکمرانوں نے ذاتی اغراض کے حصول میں تعصب کو ہی بنیاد بنایا، حاکموں کی تقرری میں یہی جذبہ کارفرما تھا، فاتح سندھ محمد بن قاسمؒ اسی تعصب کی بھینٹ چڑھے تھے، خلیفہ سلیمان کا حجاج کے رشتہ داروں کو سزائیں دینا، یزید ثانی کا آل مہلب کو ختم کرنا، ولید ثانی کا عبداللہ قسری کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرنا یہ سب اسی قبائلی عصبیت کے شاخسانے ہیں۔

عباسیوں نے بنی امیہ کی بساط الٹ دی، پھر پورے خاندان کو موت کے گھاٹ اتار دیا، مُردوں کو قبروں سے نکال کر پامال کیا، بنو فاطمہ اور علویوں پر بے تحاشا مظالم ڈھائے، خلیفہ منصور نے محمد ذوالنفس الزکیہؒ اور ان کے بھائی ابراہیمؒ کے ساتھ سخت ناروا سلوک کیا، ہارون رشید کا رویہ بھی علویوں کے ساتھ کچھ اسی طرح کا تھا۔

قومیت پرستی کا یہ سریع الاثر زہر عثمانی خلافت کے زوال کا بھی سبب بنا، عربوں میں علاقائی عصبیت نے سر اٹھایا، غیروں کی طرف سے یہ کامیاب پروپیگنڈہ کیا گیا کہ عرب دنیا کی سب سے اچھی قوم ہے اور ترکوں نے انھیں غلام بنا رکھا ہے، مسلمانوں کی ہزار سالہ وحدت اسلامی' علاقائی ونسلی تعصب کی وجہ سے پارہ پارہ ہوگئی، عثمانی خلافت سے آزاد ہوئے اسلامی ممالک یہودیوں اور عیسائیوں کے محکوم ہوگئے، عرب ملک چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہوکر اپنی طاقت، اہمیت اور اپنی حیثیت کھو بیٹھے جبکہ ترکی سے اسلام کا نام تک مٹادینے کی کوشش کی گئی۔

مصر کی طرف آیئے، جمال عبدالناصر نے وطنی تفاخر کی پرزور صدا بلند کی، جو درحقیقت مصری سوسائٹی اور مصری فکر ودماغ کی تشکیل

جدید کی طرف ایک ٹھوس اقدام تھا، بلکہ پوری عرب قوم کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کا ابتدائی مرحلہ تھا، حکومت نے عرب قومیت پر ایک مذہب اور عقیدہ کی طرح زور دیا، اہل قلم اور ادیبوں نے ایک بلند ترین مقصد اور آدرش کی حیثیت سے اس کے گن گائے، اسلام کے بجائے رسوائے عالم فرعون کی نسبت پر اظہار تفاخر کیا جانے لگا اور مصر کی گلیوں میں اس نعرہ کی گونج سنائی دینے لگی: "نحن العرب ونحن أبناء الفراعنة" (ہم عرب ہیں اور ہم فراعنہ کی اولاد ہیں)۔ قومیت عربیہ کے اس فتنہ نے ملک کی قوت وآزادی اور ترقی کی راہیں مسدود کردیں، مصر جو مرکزی منصب پر واپس آسکتا تھا اور عالم اسلام کی تربیت ورہنمائی میں کلیدی کردار ادا کرسکتا تھا وہ مغرب کی چکاچوند تہذیب میں الجھتا ہی چلا گیا۔

عراق وشام میں بھی یہی ہوا، قومی عصبیت نے ان کو بھی زوال وادبار سے دوچار کیا، ایک طویل عرصہ تک بعث پارٹی وہاں کی سیاست وحکومت پر حاوی رہی، اس کے طریقہ کار اور مذہب اسلام کے تئیں اس کی وفاداری کو سمجھنے کے لیے اس کا منشور (Manifesto) پڑھیے جس میں یہ وضاحت ہے:

"حزب البعث ایک قوم پرست جماعت ہے جو اس بات پر عقیدہ رکھتی ہے کہ قومیت ایک ازلی اور زندہ حقیقت ہے۔

عرب قوم ایک ثقافتی وحدت ہے اور اس کے فرزندوں کے درمیان تمام اختلافات وامتیازات سطحی اور بے اصل ہیں جو عربی وجدان کی بیداری کے ساتھ خود زائل ہوجائیں گے۔

قومی رابطہ ہی عربی حکومت میں واحد موجود رابطہ ہے جو اہل وطن میں ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرسکتا ہے۔"

اسلامی قومیت ہی کی بنیاد پر وجود میں آنے والا ایک ملک پاکستان بھی ہے جہاں نسلی، لسانی اور صوبائی تعصب کی آگ بھڑکتی رہی، اسی قومی تعصب کی وجہ سے مشرقی پاکستان "بنگالی قومیت" کے سحر میں مبتلا ہوا اور بنگلہ دیش کے نام سے بنگالیوں کا دیس بن گیا، بنگالی بولنے والوں نے کفار کی مدد لی اور غیر بنگالیوں کا خون پانی کی طرح بہایا، مسلم طاقت آپس میں ٹوٹتی بکھرتی رہی، اپنے ہی خون سے اپنی ہی سرحدیں لالہ زار رہیں۔

یہ سب عصبیت کی وہ دلخراش مثالیں جو تاریخ اسلام میں مسلمانوں کے خون سی لکھی گئی ہیں، تہذیب اسلامی کی بنیادوں کو اسی عصبیت کے دیمک نے چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر ڈالا۔

الغرض ابتدا ہی سے فرقہ پرستی کا مرض مسلمانوں میں پنپتا رہا اور حکومت اسلامیہ کی بے پناہ طاقت اسی میں ضائع ہوتی رہی، عوام اور حکومت کی وہ کوششیں جو اسلام کی اشاعت میں صرف ہونی چاہیے تھیں ان فرقہ پرستیوں کی نذر ہوگئیں جس کا منطقی انجام سقوط غرناطہ اور سقوط بغداد کی شکل میں ظاہر ہوا۔

آپ کسی بھی عہد کا مطالعہ کیجیے تو مسلمانوں کو کھوکھلا کرنے والا بنیادی سبب یہی فرقہ پرستی اور اس کے مظاہر ہیں، ذاتی وخاندانی عصبیت، قبائلی رقابتیں، علاقائی جھگڑے اور رنگ ونسل کے امتیازات ملت اسلامیہ کو اس طرح کھا رہے ہیں جیسے لکڑی کو گھن کھا جاتی ہے۔

ذلت وادبار کے اس دور میں بھی ملت اسلامیہ کی کوششوں کا ننانوے فیصد اسی فرقہ پرستی کی نذر ہورہا ہے۔ اسلام کے نام پر کی جانے والی کوششوں کا حقیقی محور مخصوص فرقہ کی نشر واشاعت سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ دینی ادارے، اسلامی تحریکات، مختلف جامعات اور انجمنوں کا وجود اسلام کی حقیقی تعلیمات کو عام کرنے اور مسلمانوں کو عصبیت جیسی جہالت سے بچانے کے لیے ہوا تھا، ابتدا میں ان اداروں نے موثر کردار بھی ادا کیا، لیکن رفتہ رفتہ یہ ادارے اور تحریکات اپنے اغراض ومقاصد کو فراموش کر بیٹھے اور اپنے وجود، اپنے دائرہ کار اور اپنی کاوشوں کو ہی دین کی حقیقی کامرانی سے مربوط اور اپنے سوا ہر کسی کو راہ حق سے بھٹکا ہوا سمجھ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ادارے اور تحریکات بجائے خود تعصب کا شکار ہوگئے۔

ذاتی واجتماعی تعصب وہ مرض ہے جس نے مسلمانوں کو کھوکھلا کرکے بام عروج سے قعر مذلت میں دھکیل دیا تھا اور آج بھی اس دلدل سے نہ نکل سکنے کی ایک بنیادی وجہ یہی تعصب ہے۔

مسلمانوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ

اسلام وایمان ہمیں جس محاذ پر لڑنے اور قربانی دینے کے لیے پکارتا ہے، وہ محاذ دشمنوں کی یلغار کے لیے خالی پڑا نظر آتا ہے، ہمارا معاشرہ سماجی برائیوں سے پُر ہے، اعمال واخلاق برباد ہیں، معاملات ومعاہدات میں فریب ہے، سود، قمار بازاری، شراب، خنزیر، بے حیائی، بدکاری ہماری زندگی کے ہر شعبہ پر چھا گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے جائز وارث اور ملک وملت کے نگہبانوں کو آج بھی اپنے سے نظریاتی اختلاف رکھنے والوں پر جتنا غصہ آتا ہے، اس سے آدھا بھی اللہ کے باغیوں پر کیوں نہیں آتا اور آپس کے نظریاتی اختلاف کے وقت جس جوش ایمانی کا اظہار ہوتا ہے، وہ ایمان کے اس اہم محاذ پر کیوں ظاہر نہیں ہوتا۔ ہمارا زورِ زبان اور زورِ قلم جس شان سے اپنے اختلافی مسائل میں جہاد کرتا ہے، اس کا کوئی حصہ اصول ایمانی پر ہونے والی یلغار کے مقابلہ میں کیوں صرف نہیں ہوتا؟ مسلمانوں کو مرتد بنانے والی کوششوں کے بالمقابل ہم سب بنیان مرصوص کیوں نہیں بن جاتے؟

آخر ہم اس پر کیوں غور نہیں کرتے کہ بعثت انبیاء اور نزول قرآن کا وہ مقصد عظیم جس نے دنیا میں انقلاب برپا کیا اور جس نے غیروں کو اپنا بنایا، جس نے اولاد آدم کو بہیمیت سے نکال کر انسانیت سے سرفراز کیا اور جس نے ساری دنیا کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، کیا وہ صرف یہی مسائل تھے؟ جن میں ہم الجھ کر رہ گئے ہیں اور کیا دوسروں کو ہدایت پر لانے کا طریق اور پیغمبرانہ دعوت کا یہی عنوان تھا جو آج ہم نے اختیار کر رکھا ہے۔

﴿أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ﴾ (الحدید: ۱۶) (کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ایمان والوں کے دل اللہ کے ذکر اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کی طرف جھک جائیں)

آخر وہ کون سا وقت آئے گا جب ہم اپنے نظریاتی اور نظامی مسائل سے ذرا آگے بڑھ کر اصول اسلام کی حفاظت اور بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کو اپنا اصلی فرض سمجھیں گے۔

اگر ہم نے یہ نہ کیا اور محشر میں ہمارے ماویٰ وملجا رسول کریم ﷺ نے ہم سے یہ سوال فرمایا کہ میری شریعت اور میرے دین پر حملے ہو رہے تھے، اسلام کے نام پر کفر پھیلایا جا رہا تھا، میری امت کو میرے دشمنوں کی امت بنانے کی کوشش مسلسل کی جا رہی تھی، قرآن وسنت کی کھلے طور پر تحریف کی جا رہی تھی، اللہ اور رسول ﷺ کی نافرمانی اعلانیہ کی جا رہی تھی، تو تم مدعیان علم کہاں تھے؟ تم نے اس کے مقابلہ پر کتنی محنت اور قربانی پیش کی؟ کتنے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ پر لگایا، تو آج ہمیں سوچ لینا چاہیے کہ ہمارا جواب کیا ہوگا؟

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 13 ♣ March 2021 ♣ Issue: 03

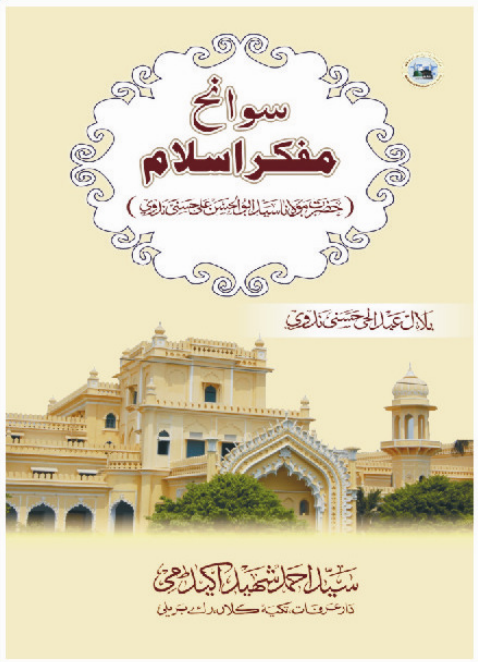

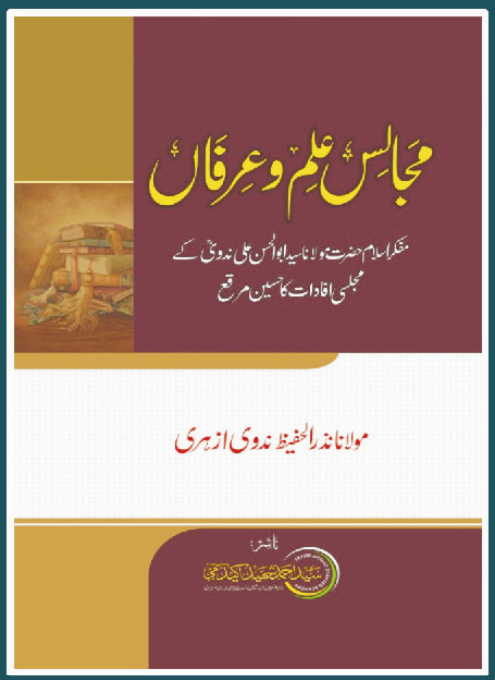

DECLARATION OF OWNERSHIP AND OTHER DETAILS
FORM 4 RULE 8

Name of Paper:	Payam e Arafat
Place of Publication:	Raebareli
Periodicity of Publication:	Monthly
Chief Editor:	Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
Nationality:	Indian
Address:	Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001
Printer/Pu	

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9565271812
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)